محمد اسحاق بھٹی

فتاویٰ عالمگیری

(۶)

مولانا حامد جونپوری

شیخ علامہ حامد جون پوری، کبارِ فقہا میں سے تھے۔ انھوں نے اکثر درسی کتابیں سید محمد زاہد بن محمد اسلم ہروی سے اور بعض علامہ محمد شفیع یزدی سے پڑھیں۔ حصولِ علم اور بحث و اشغال میں مصروف رہتے، یہاں تک کہ اپنے شیوخ کی زندگی ہی میں اکثر علوم و فنون میں مہارت پیدا کرلی تھی۔ ان کی قابلیت کی بنا پر شاہ جہان بادشاہ نے روزانہ ان کے لیے باقاعدہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اس کے بعد عالم گیر نے فتاویٰ عالم گیری کی تدوین کے سلسلے میں ان کی خدمات حاصل کرلیں اور اپنے لڑکے محمد اکبر کا معلم مقرر کر دیا۔ مولانا حامد جون پوری شیخ سلطان محمود عثمانی جون پوری کے پوتے تھے۔[۱]

تذکرہ علمائے ہند میں بھی ان کا تعارف تقریباً اسی طرح کرایا گیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

"ملا حامد جون پوری اکثر کتب متداولہ از محمد زاہد دیدہ و بعض علم در خدمت دانشمند خان استفادہ نمودہ۔ در عہد شاہ جہان بسلک بروزینہ داران منسلک بود و در عہدِ عالم گیر داخل مؤلفینِ فتاویٰ شدہ بتعلیم شاہ زادہ محمد اکبر سرفرازی یافتہ"[۲]

اساتذہ

مولانا حامد جونپوری، ان خوش قسمت علما میں سے ہیں، جنھوں نے بڑے اونچے درجے کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں سید محمد زاہد ہروی بھی ہیں جن کا شمار مشاہیرِ ہند میں ہوتا ہے۔ اتنے ذہین اور تیز فکر عالم تھے کہ تیرہ سال کی عمر میں مسندِ تدریس اور منصبِ افتا پر فائز ہوگئے

۱؎ نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۶۰

۲؎ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۴

تھے۔ پہلے ان کا رابطہ شاہ جہان سے ہوا۔ بعد ازاں (۱۰۷۰ھ) میں عالم گیر نے فوج کا محکمۂ احتساب ان کے سپرد کر دیا۔ اکبر آباد (آگرہ) میں مسندِ درس پر فائز رہے۔ منطق و فلسفہ اور علومِ عقلیہ میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ متداول درسی کتابوں میں سے شرح المواقف، شرح التہذیب اور بحث تصور و تصدیق تک رسالہ قطبیہ پر حواشی لکھے۔ اور ۱۱۰۱ھ میں وفات پائی۔[1]

اولاد

مولانا حامد جون پوری کے ایک بیٹے کا نام الشیخ علامہ یوسف تھا، جن کا شمار اکابر علمائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ یہ جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے عظیم القدر باپ مولانا حامد جون پوری سے تعلیم حاصل کی اور بڑا نام پیدا کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سلسلۂ درس شروع کیا اور وسعتِ مطالعہ و کثرتِ معلومات کے سبب منصب افتا پر متمکن ہوئے اور اکابر علمائے عصر کی جماعت سے گردانے گئے۔ اس دور میں شیخ محمد افضل جون پوری کے مدرسہ میں فنِ تدریس میں ان کا کوئی مدِ مقابل نہ تھا اور اس مدرسہ کی ریاست علمیہ کا منتہائے نظر یہی تھے۔ ان کی قبر چاچک پور میں ہے۔[2]

مولانا جلال الدین مچھلی شہری

شیخ، عالم، فقیہ جلال الدین جعفری ہاشمی مچھلی شہری۔ قاضی ثناء الدین جعفری زینبی ہاشمی کی نسل سے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت جعفر طیار بن ابی طالب تک پہنچتا ہے۔ مچھلی شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ میدانِ تعلیم میں آئے تو فقہ و اصول میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ خود درس و تدریس کا چشمۂ فیض جاری کیا جس سے عرصہ تک لوگ مستفیض ہوتے رہے۔ بعد ازاں بادشاہِ ہند عالم گیر کے حکم سے فتاویٰ عالم گیری تصنیف کرنے والے علمائے کرام کی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی۔ کہتے ہیں تنہا انھوں نے فتاویٰ عالم گیری کی ایک جلد تصنیف کی۔[3]

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۳۰۷، ۳۰۸ و تذکرہ علمائے ہند (فارسی) ص ۱۸۷، ۱۸۸۔

[2] نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۴۲۳ (بحوالہ تجلی نور)، [3] ایضاً ج ۶، ص ۵۶

قاضی علی اکبر الہ آبادی

شیخ، عالم، فقیہ، قاضی علی اکبر حسنی حنفی الہ آبادی، فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے نامور اور سرکردہ علما میں سے تھے۔ پہلے سعد اللہ خاں وزیر[1] نے ان سے قرب پیدا کیا اور اپنے بیٹے لطف اللہ خاں[2] کے لیے معلم مقرر کیا۔ لطف اللہ خاں طویل مدت تک ان کی خدمت میں رہا اور علوم و معرفت کا بہت بڑا ذخیرہ ان سے حاصل کیا۔ پھر ان کا عالمگیر سے قرب و تعلق پیدا ہو گیا اور اس نے ان کو اپنے بیٹے محمد اعظم کا اتالیق مقرر کر دیا۔ عالمگیر کو علوم دینیہ میں ان کی وسعتِ نظر، استحضار، تقویٰ الٰہی اور بے پناہ نیکی کا علم ہوا تو انھیں لاہور کے محکمۂ قضا پر متعین کر دیا گیا اور پھر وہ اپنی پوری زندگی اسی عہدۂ رفیعہ پر فائز رہے۔ قضا کے سلسلے میں نہایت قابلِ قدر کردار کے مالک تھے اور اس منصبِ جلیلہ میں ان کو بڑی عظمت حاصل تھی۔ لوگوں پر کڑی نگرانی رکھتے تھے، حدود و تعزیرات کے اجرا کے باب میں صاحبِ عزیمت تھے۔

مآثر الامرا میں خوانی خان کہتا ہے کہ امرائے دولت ان سے بڑے ناراض رہتے تھے۔ لیکن

---

[1] یہ سعد اللہ خاں لاہوری کے نام سے مشہور ہیں۔ چنیوٹ کے باشندے تھے۔ نہایت نیک، عالم اور دانا تھے۔ حافظِ قرآن تھے۔ علامہ یوسف کیاہی لاہوری کے شاگرد تھے۔ عرصہ تک مسجد وزیر خان (لاہور) میں درسِ علوم دیتے رہے۔ لوگوں سے الگ تھلگ اور امرا سے دُور رہتے تھے۔ شاہ جہان بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہونے کے چودھویں سال لاہور آیا تو ان کے اوصاف سے مطلع ہوا اور موسوی خاں صدر کے ذریعے اپنے ہاں تشریف لانے کی درخواست کی، چنانچہ یہ اتوار کے روز ۱۷ رمضان ۱۰۵۰ھ میں اس کے پاس گئے۔ بعد ازاں بادشاہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر بہت سے مناصب عطا کیے اور انھوں نے نہایت مشکل مہمات انجام دیں۔ بادشاہ ان پر اعتماد کرتا تھا اور یہ وزرا میں واحد شخص تھے جو ادب، انشا، تدبیر و سیاست، نظم و نسق، عذوبتِ لسان، حلاوتِ کلام، اصابتِ فکر اور شجاعت و بہادری میں یگانۂ روزگار تھے۔ ۲۶ ربیع الآخر/جمادی الاخریٰ ۱۰۶۶ھ میں بعارضۂ قولنج وفات پائی۔ بادشاہ نے ان کی وفات پر بہت حزن و ملال کا اظہار کیا۔ (نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۱۵۲ تا ۱۵۳)

[2] سعد اللہ خاں وزیر کی وفات کے وقت لطف اللہ خاں گیارھویں سال میں تھا۔ یہ بھی باپ کی طرح فضل و کمال، شجاعت و بسالت اور علم و فضل میں بہت معروف تھا۔ باپ کی وفات کے بعد شاہ جہان نے اسے اپنی تربیت میں لے لیا تھا۔ عالمگیر نے زمامِ سلطنت ہاتھ میں لی تو درجہ بدرجہ اس کو بہت ترقی دی۔ ۱۱۴۳ھ میں عہدِ عالمگیری میں فوت ہوا۔ (نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۲۲۴)

عالمگیر کی ہیبت اور اس کا دبدبہ کسی کو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور ہاتھ بڑھانے کی جرأت نہیں ہونے دیتا تھا ۔ اسی اثنا میں امیر قوام الدین اصفہانی کو لاہور کا والی مقرر کیا گیا ۔ اس نے نظام الدین کوتوال کو اشارہ کیا کہ ان پر قابو پاتے ۔ کوتوال ان کی طرف اپنے آدمی لے کر گیا ۔ اور ان کو اپنی گرفت میں لے لیا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قاضی علی اکبر اور ان کے بھانجے سید فاضل کو قتل کر دیا گیا ۔ جب یہ بات عالمگیر کو معلوم ہوئی تو اس نے قوام الدین اور نظام الدین کوتوال کو ان کے مناصب سے علیحدہ کر دیا ۔ اس کے بعد کوتوال مذکور کو قاضی کے ورثا کے حوالے کر دیا گیا ۔ انھوں نے اس کو بطور قصاص کے قتل کر دیا ۔ پھر عالمگیر نے قاضی شیخ الاسلام فتنی کو حکم دیا کہ امیر قوام الدین کے مقدمہ کا شریعت کے مطابق فیصلہ کیا جائے ۔ لیکن ان کے ورثا نے اس کو معاف کر دیا ۔

قاضی علی اکبر مصنف بھی تھے اور مختلف علوم پر ان کی گہری نظر تھی ۔ ان کی تصنیفات میں سے فارسی زبان کی مشہور درسی کتاب فصولِ اکبری ہے اور عربی زبان میں اصولِ اکبری اور اس کی شرح ہے ۔ یہ دونوں کتابیں علمِ صرف سے متعلق ہیں ۔

یہ علما کی اس بلند مرتبت جماعت سے تعلق رکھتے ہیں ، جن کو عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین پر متعین کیا ۔

قاضی علی اکبر الہ آبادی ۱۰۹۰ھ میں قتل کیے گئے [1]

مآثرِ عالمگیری میں ان کا ان الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے :

دار السلطنت لاہور کے واقعہ نگار نے اطلاع دی کہ سید علی اکبر قاضی شہر ، اپنی دیانت و طبیعت کی سختی و تیزی کی وجہ سے کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا تھا ۔ قاضی مذکور کی وضع کے خلاف اس کا ہمشیر زادہ سید فاضل نام اپنی کم عقلی کی وجہ سے دست دراز و بدزبان تھا ۔ لاہور کے حکام یعنی ناظر و کوتوال شہر اس شخص کے دست و زبان سے تنگ آگئے تھے اور مجبور ہو کر اس کی جان لینے کے خواہاں ہوئے ۔

"قاضی مذکور نے بھی اس فتنہ و آشوب میں امیر قوام الدین ناظم لاہور کے ہاتھوں بے حد ذلت و رسوائی کے ساتھ اپنی جان دی ۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ، ص ۲۸۱

ناظم و نظام الدین کوتوال دونوں اشخاص خدمت و خطاب سے برطرف فرمائے گئے۔ نظام الدین کوتوال لاہور ہی میں ختم ہوا اور قوام الدین حضورِ شاہی میں طلب کیا گیا۔ قوام الدین کے بجائے بادشاہ زادہ محمد اعظم ناظم پنجاب مقرر ہوئے اور طرۂ مرصع کے عطیہ سے سرفراز فرمائے گئے۔ لطف اللہ خان کو صوبے کی نیابت عطا ہوئی اور اس امیر کے تغیر سے ابو نصر خاں کو خدمتِ عرض مکرر پر مقرر فرمایا گیا۔

قوام الدین خاں اجمیر میں آستانۂ والا پر حاضر ہوا۔ محکمۂ شرعیہ میں مقدمہ دائر ہوا اور قوام الدین روزانہ عدالت میں ذلیل و خوار ہونے لگا۔ آخر کار پسر سید علی اکبر مرحوم، اعزۂ دربار کی سفارش سے دعویٔ قصاص طلبی سے باز آیا۔ خان مذکور کو خود ہی اپنے حال پر رحم آیا اور اس نے جلد سے دنیا کو خیرباد کہا[1]

قاضی عبدالصمد جون پوری

فتاویٰ عالم گیری کے مصنفین کی فہرست میں قاضی عبدالصمد جون پوری بھی شامل تھے۔ قاضی صاحب نہایت فاضل آدمی تھے اور فقہ و اصول کے چوٹی کے علما میں سے تھے۔ ہندوستان کے معروف عالم علامہ محمد رشید بن مصطفیٰ عثمانی جون پوری کے بھتیجے اور شاگرد تھے۔ ایک عرصہ تک ان سے وابستہ رہے یہاں تک کہ تمام علوم و فنون میں سب پر فوقیت حاصل کر گئے۔ پھر دہلی گئے اور ان علمائے کرام کی جماعت میں شرکت اختیار کی، جو فتاویٰ عالم گیری کی تصنیف پر مامور تھے بعد ازاں دکن کے ایک شہر میں عہدۂ قضا پر متعین کر دیے گئے اور خاصی مدت اس عہدہ پر فائز رہے۔ پھر لکھنؤ منتقل ہو گئے اور وہاں آٹھ سال قیام پذیر رہے۔ بادشاہ نے انھیں کئی گاؤں عطا کیے۔ ۲۷ رجب کو بلادِ دکن میں وفات پائی اور ان کی نعش ایک گاؤں "سوکلائی" لائی گئی اور وہیں قاضی باغ (حدیقۃ القاضی) میں مدفون ہوئے۔ "باغِ بہار" میں اسی طرح مرقوم ہے[2]

ان کے استاد

مناسب معلوم ہوتا ہے، یہاں قاضی عبدالصمد جون پوری کے استاذِ مکرم علامہ محمد رشید کا

---

[1] مآثر عالم گیری (اردو ترجمہ) ص ۲۰۸ [2] نزہۃ الخواطر ج ۶، ص ۱۵۲

تعارف بھی چند الفاظ میں کرا دیا جائے۔ یہ محمد مصطفیٰ بن عبد الحمید عثمانی جون پوری کے لڑکے تھے۔ فقہ، اصول اور تصوّف وغیرہ تمام اصنافِ علم میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ مشہور بزرگ شیخ سری بن مفلس سقطی عثمانی کی اولاد سے تھے۔ اٹھارہ واسطوں سے ان کا سلسلہ نسب شیخ سری تک پہنچتا ہے۔

علامہ محمد رشید ۱۰ ذوالقعدہ ۱۰۰۰ھ کو "برونہ" نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے جو اعمالِ جونپور میں واقع تھا۔ ان کی والدہ شیخ نور الدین بن عبد القادر صدیقی برونوی کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے اپنے ننھیال میں پرورش پائی اور مختلف اساتذہ سے علوم کی تمام ابتدائی اور انتہائی کتابیں پڑھیں۔

دیگر علوم کے علاوہ تصوّف و طریقت سے بھی کامل وابستگی رکھتے تھے۔ خرقہ طریقت دورِ طفولیت ہی میں اپنے والدِ محترم سے زیبِ تن کیا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ تصوف اور اذکار و اشغال سے شدید اشتغال کے باوصف، علوم سے سلسلۂ تعلق منقطع نہیں کیا۔ طویل مدت تک درس و افادہ میں منہمک رہے۔ بعد ازاں مطالعۂ کتبِ حقائق میں مشغول ہوگئے۔ شیخ محی الدین ابن العربی کی تصنیفات کو خصوصیت سے مرکزِ توجہ ٹھہرایا۔

امرا و اغنیا کے ساتھ اختلاط سے دامن کشاں رہتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب ان کا شہرۂ کمال شاہ جہان بادشاہ تک پہنچا تو اس نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور ایک مکتوب کے ذریعے اپنے ہاں تشریف لانے کی استدعا کی لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور کسی صورت میں اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنے پہ آمادہ نہ ہوئے۔

ان کے کچھ مسلکی مختارات تھے، جن پر پابندی سے عمل کرتے۔ مثلاً سری نمازوں میں فاتحہ خلف الامام پر سختی سے عامل تھے۔ فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان تھوڑی دیر اضطجاع کرتے (لیٹتے) تھے۔ وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ اس زمانے کے رواج کے مطابق موت کے بعد انھیں عمامہ نہ پہنایا جائے۔ نہ کوئی چارپایہ ذبح کیا جائے اور ایصالِ ثواب کی خاطر اس کا گوشت پکایا جائے، نہ تین دن سے زیادہ افسوس کیا جائے اور نہ پختہ قبر بنائی جائے بلکہ مٹی کی کچی قبر بنائی جائے۔

یہ بہترین مصنف بھی تھے۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کتابیں لکھیں۔ فنِ مناظرہ کی

مشہور کتاب رشیدیہ انہی کی تصنیف ہے، جو باقاعدہ درس نظامیہ میں شامل اور علما و طلبا میں متداول ہے۔ شرح ہدایۃ الحکمۃ اور شیخ اکبر کی اسرار المخلوقات پہ ایک شرح سپرد قلم فرمائی۔ عربی زبان میں خلاصۃ النحو کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ فارسی زبان میں زاد المساکین اور مقصود الطالبین بھی ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔ ان کا ایک دیوان بھی ہے جو بہت سے اشعار پر مشتمل ہے۔ ملفوظات بھی ہیں جو شیخ نصرت جمال ملتانی نے گنج ارشدی میں جمع کیے ہیں۔ علاوہ ازیں مودود بن محمد حسین جون پوری نے بھی ان کے ملفوظات جمع کیے ہیں۔

جمعہ کے روز ۹۔ رمضان ۱۰۸۳ھ میں (۸۳ سال عمر پاکر) فوت ہوئے۔

ان کی وفات بھی عجیب طرح واقع ہوئی۔ فجر کی سنتوں سے فارغ ہو کر فرض پڑھنے لگے تھے کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ ان کے حالات "گنج ارشدی" میں مرقوم ہیں۔[۱]

مولانا ابوالواعظ ہرگامی

علامہ ابوالواعظ بن صدر الدین بن محمد اسماعیل بن قاضی عماد الدین احمد عمری بدایونی ہرگامی نہایت فاضل آدمی تھے اور اپنے دور کے مشہور علما میں سے تھے۔ موضع ہرگام میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ تمام عمر تعلیم و تدریس اور تشنگانِ علوم کو فائدہ پہنچانے میں صرف کر دی۔ مآثر الکرام کے بیان کے مطابق ان کے شاگردوں میں شیخ مربی بن عبدالغنی بلگرامی کا اسم گرامی شامل ہے۔

تذکرۃ الانساب میں مرقوم ہے کہ عالم گیر بادشاہ نے بھی ان سے تعلیم حاصل کی۔

مولانا ابوالواعظ کے دادا عماد الدین اس خاندان کے پہلے شخص ہیں جو ہرگام میں آکر آباد ہوئے تھے۔ انھوں نے وہاں کے قاضی سے شرف تلمذ حاصل کیا اور اس کی بیٹی سے شادی کی اور پھر وہیں گھر بنا لیا اور مستقل رہائش اختیار کر لی۔

صاحب التسویہ شیخ محب اللہ الٰہ آبادی مولانا ابوالواعظ کے چچا زاد تھے۔

آمد نامہ کی روایت کے مطابق مولانا ابوالواعظ فتاویٰ عالم گیری کے مصنفین میں شامل تھے۔[۲]

۱؎ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۶ تا ۲۷۔ ۲؎ نزہۃ الخواطر ۵، ص ۳۴، ۳۵۔

ان کے چچازاد بھائی مولانا محب اللہ الٰہ آبادی بہت بڑے عالم اور کبار مشائخ چشتیہ میں سے تھے۔ سوموار کے روز ۲ صفر ۹۹۶ھ میں علاقہ خیرآباد کے ایک گاؤں صدرپور میں پیدا ہوئے اور حصولِ علم میں مصروف ہو گئے۔ پھر لاہور آ گئے۔ وہاں مفتی عبدالسلام لاہوری سے پڑھنا شروع کیا۔ اس زمانے میں شیخ محمد میر سائیں سیوستانی اور وزیر سعداللہ خاں ان کے ہم درس تھے۔ سعداللہ خاں عہدِ شاہجہانی میں وزارتِ عظمیٰ پہ فائز ہوا تو اس نے ان دونوں ہم درس دوستوں کو دارالسلطنت تشریف لانے کی دعوت دی۔ شیخ محمد میر سائیں نے زہد و قناعت کی زندگی اختیار کر لی تھی، لہٰذا انھوں نے تو اس دعوت کا کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ شیخ محب اللہ اس کے پاس دہلی گئے۔ سعداللہ خاں نے عہدۂ نظامت ان کے سپرد کیا اور ان کے وطن الٰہ آباد بھیج دیا جیساکہ ذیل الوفیات میں مرقوم ہے۔

بحرِ زخار کی روایت ہے کہ شیخ محب اللہ طلبِ رزق کے سلسلے میں الٰہ آباد سے دہلی آئے، اور سابق تعلقات کی بنا پر نواب سعداللہ خاں سے ملے اور اس کی وساطت سے منصبِ نظامت پر متعین ہوئے لیکن بعدازاں ان کی کیفیاتِ قلبی اس طرح بدلیں اور طبیعت نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ تمام علائقِ دنیا سے منقطع ہو کر اللہ سے تعلق جوڑ لیا اور عبادت و زہد کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ عازمِ گنگوہ ہوئے اور طریقہ چشتیہ کے مطابق شیخ ابوسعید بن نور حنفی گنگوہی سے منسلک ہو گئے اور طویل عرصہ تک وہاں رہے۔ رتبۂ مشیخیت کو پہنچے اور اپنے گاؤں صدرپور واپس آ گئے۔ کچھ مدت وہاں اقامت پذیر رہنے کے بعد الٰہ آباد چلے گئے اور وہاں دریائے جمنا کے کنارے کٹیا بنا کر بیٹھ گئے اور فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کر لی۔ پھر اللہ نے ایک اور انقلاب پیدا کیا۔ ابوابِ رزق وا کیے اور مختلف انواعِ نعمت سے نوازا۔ اس کے بعد پورے بیس سال مسندِ ارشاد پر متمکن رہے۔

بعدازاں ان کی زندگی نے ایک اور پلٹا کھایا اور شیخ محی الدین ابن عربی کے بعض اقوال کی اس انداز سے تشریح کی کہ لوگوں میں ان کے بارے میں کئی رائیں پیدا ہو گئیں۔ ایک یہ کہ یہ بہت بڑے عارف ہیں اور معارف صحیح بیان کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ عارف تو ضرور ہیں لیکن تعبیر میں اس درجہ ٹھوکر کھا گئے ہیں کہ الحاد و زندقہ کی وادی میں جا گرے ہیں۔ تیسرے یہ کہ شدید گمراہی میں مبتلا ہیں اور لوگوں کو

گمراہی کی تلقین کرتے ہیں۔

بہرحال مولانا ابوالواعظ ہرگامی کے یہ چچا زاد بھائی مولانا محب اللہ الہ آبادی بہت بڑے عالم تھے اور متعدد اونچے پایہ کی کتابوں کے مصنف اور شارح تھے۔

۹ رجب ۱۰۵۸ھ میں الہ آباد میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔[۱]

مولانا محب اللہ کے تذکرہ میں شیخ محمد میر کا ذکر بھی آیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں بھی چند سطور تحریر کردی جائیں۔

شیخ محمد میر عمری سیوستانی لاہوری، بہت بڑے بزرگ اور مقاماتِ عالیہ اور کراماتِ جلیلہ کے حامل تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ ۹۵۷ھ میں سیوستان میں پیدا ہوئے اور عمر کی کچھ منزلیں وہیں طے کیں۔ پھر حصولِ علم کے لیے واردِ لاہور ہوتے اور مفتی عبدالسلام لاہوری کے حلقۂ درس میں شریک ہو گئے۔ طریقت کے لیے شیخ خضر سیوستانی کے باب عالی پر دستک دی اور انہی کے اشارے سے لاہور آئے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال تھی۔ پورے چالیس سال لوگوں سے الگ اور دنیا سے قطع تعلق کرکے متوجہ الی اللہ رہے۔ یہاں تک کہ اللہ نے ان کے لیے حقائق و معارف کے دروازے کھول دیے اور علمائے راسخین کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ لوگ ان کی طرف دوڑے اور سلوک و سلاطین نے ان کے حضور سر جھکا دیے۔ بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ نہ کسی کی نذر قبول کرتے اور نہ کسی سے تحائف وصول فرماتے۔ معمولی کپڑے اور سادہ کھانے پر اکتفا فرماتے۔

عمل صالح میں محمد صالح کمبوہ نے نہایت احترام سے ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ پورے ساٹھ سال لاہور میں اقامت گزین رہے اور بے شمار لوگ ان سے مستفیض ہوئے۔ شاہ جہان بادشاہ نے کشمیر سے واپسی پر ان کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور ان کے فضل و کمال کی فراوانیوں سے بہت متعجب اور متاثر ہوا۔

۷ ربیع الاوّل ۱۰۴۵ ہجری کو لاہور میں وفات پائی۔ ان کی قبر اسیاں میر لاہور میں) مرجع

---

[۱] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۲۲ تا ۳۲۵۔ نیز دیکھیے تذکرہ علمائے ہند (فارسی) ص ۱۷۵

خلائق ہے[1]

مولانا ابوالواعظ کے شاگرد

مآثر الکرام میں فتاویٰ عالمگیری کے اس مرتب یعنی مولانا ابوالواعظ کے حلقۂ درس کا بھی ذکر کیا گیا ہے (جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے) ان کے شاگردوں میں سید مربی بن عبدالنبی بلگرامی کا اسمِ گرامی بھی تذکروں میں مرقوم ہے۔ سید مربی بن عبدالنبی بن طیب بن عبدالواحد حسینی بلگرامی اللہ کے نیک بندوں میں سے تھے اور عظیم القدر عالم تھے۔ یہ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور سید اسماعیل حسینی بلگرامی سے تحصیل علم کی۔ پھر عازم قنوج ہوئے اور شیخ یٰسین قنوجی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔ اس کے بعد ہرگام گئے اور باقی درسی کتابیں مولانا ابوالواعظ ہرگامی سے پڑھیں تحصیلِ علم کے بعد اپنے شہر بلگرام تشریف لے گئے اور اپنے آپ کو درس و افادۂ عام کے لیے وقف کر دیا۔ سید مربی بن عبدالنبی کے جاری کردہ چشمۂ علم سے شیخ محمد عاقل اترولوی، سید طفیل محمد بلگرامی اور بہت سے لوگوں نے اپنی علمی پیاس بجھائی۔

سید مربی کا انتقال پیر کے روز ۴ شعبان ۱۱۱۷ھ کو ہوا[2]

تذکرہ علمائے ہند میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"سید مربی بلگرامی عالم عارف بود۔ خلائق ازو منتفع می شدند۔ ہزار و یکصد و ہفدہ ہجری وفات یافت[3]"

مفتی ابوالبرکات دہلوی

فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین کی طویل فہرست میں دارالسلطنت دہلی کے مفتی ابوالبرکات کا نام نامی بھی اُس دَور کے مختلف تذکروں میں مرقوم ہے۔ اس عالم کبیر اور فقیہ نامدار کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

مفتی ابوالبرکات بن حسام الدین بن سلطان بن ہاشم بن رکن الدین بن جمال الدین بن سماء الدین حنفی دہلوی۔ مفتی ابوالبرکات کا شمار اُس زمانے کے کبار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے یہ شہر اس زمانے میں علما و فقہا کے عظیم مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی شہر کی علمی فضاؤں میں ان کی

۱؎ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۲
۲؎ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۶۸
۳؎ تذکرہ علمائے ہند (فارسی) ص ۲۷۶

پرورش ہوئی اور بڑے بڑے علما کرام کے فیضِ صحبت سے لطف اندوز ہوتے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو عہدِ عالمگیری میں پہلے دہلی کی مسندِ افتا پر اور پھر اسی شہر کی مسندِ قضا پر متمکن کیے گئے۔

فقہی مسائل سے متعلق ان کی ایک تصنیف ہے، جس کا نام "مجمع البرکات" ہے اور دو عظیم جلدوں کو محتوی ہے۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"الحمد للہ الذی نور قلوب الموحدین بنور التوحید والایمان" الخ اس کی وجہ تالیف انھوں نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"لما کانت الروایات اشتاتا متفرقۃ جمعتہا جمعا لیسہل الوقوف بہا ورتبتہا ترتیبا لیتیسر الاطلاع علیہا فی ھذا المختصر" الخ

مجمع البرکات کی تالیف سے مفتی ابوالبرکات ۹ ذی الحجہ ۱۱۱۶ھ میں فارغ ہوئے۔ فقہ اور اصول میں انھیں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ اسی بنا پر "شمس التواریخ" کے بیان کے مطابق یہ فتاویٰ عالمگیری کے مصنفین کی خوش بخت جماعت میں شامل ہوئے [۱]

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۶ ؛ ص ۴۔

مسلمانوں کے سیاسی افکار

از: پروفیسر رشید احمد

مسلمان مفکروں نے سیاسی نظریہ سازی کی تاریخ میں بہت اہم ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب میں مختلف زمانوں اور مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے مسلمان مفکروں اور مدبروں کے سیاسی نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں قرآنی نظریہ مملکت کی بخوبی وضاحت کی گئی ہے جو ان سب مسلمان مفکروں کے نظریوں کی اساس ہے۔

یہ کتاب بی۔ اے کے نصاب میں داخل ہے۔ صفحات: ۴۴۰ قیمت: ۶/۵۰

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور